یادیں

طاہر جاوید مغل

یوم آزادی کے موقع پر مصنف کا تحفۂ خاص

کچھ لوگوں کے نزدیک بچپن کی سنہری یادیں ہر شے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ قیام پاکستان کے دوران بے شمار لوگوں نے ہجرتوں کے عذاب جھیلے لیکن مرتے دم تک وہ چھوڑے ہوئے در و دیوار نہیں بھولے... کچھ کے راستے میں لالچ اور طمع یوں آن کھڑا ہوا کہ پچھتاوے تمام عمر کا روگ بن گئے۔

عبدالرؤف کا گھر لاہور کی پرانی آبادی اچھرہ میں تھا۔ یہاں وہ اپنی بیوی فاخرہ، اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ دراصل تقسیم سے پہلے کی ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ اس کے فلیٹ نما حصوں میں پانچ چھ گھرانے آباد تھے۔ اللہ بخش نامی ایک کارخانہ دار اس عمارت کا مالک تھا اور وہ سب اسے کرایہ ادا کرتے تھے۔

رؤف ایک اچھا ''کارپینٹر'' تھا۔ بیوی بھی اکثر بیمار رہتی تھی۔ آمدن کم اور خرچے زیادہ تھے۔ بس زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی۔ اس روز رؤف کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلا تو سامنے ہی اللہ بخش صاحب نظر آ گئے۔ رؤف نے جلدی سے حساب جوڑا۔ آج بارہ تاریخ تھی۔ کرایہ زیادہ

لیٹ تو نہیں ہوا تھا، پھر سویرے سویرے اللہ بخش صاحب کی صورت کیوں نظر آ گئی تھی؟

"السلام علیکم ملک صاحب!" رؤف نے اپنی بائی سائیکل دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔ دراصل تم لوگوں کو ایک اطلاع دینی تھی...... کل کچھ مہمان آ رہے ہیں۔" ملک اللہ بخش صاحب نے اپنا ویسپا اسکوٹر اسٹینڈ پر لگاتے ہوئے خبر دی۔

"کیسے مہمان جی؟"

"ابھی ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں۔ تھانے سے ایس ایچ او صاحب کا فون آیا تھا۔ انڈیا سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ وہ اپنے پرانے گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک ہی برادری کے لوگ ہیں اور پاکستان بننے سے پہلے ہماری اسی بلڈنگ میں رہتے رہے ہیں۔ یہاں ننکانہ صاحب میں یاترا کے لیے آتے ہیں تو انہوں نے سوچا ہے کہ اپنا پرانا محلہ بھی دیکھ لیں۔"

"تو ان کے لیے چائے پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔" رؤف نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

"نہیں کوئی ایسا خاص انتظام نہیں۔ وہ زیادہ دیر نہیں رکیں گے اور اگر کچھ کرنا ہی ہوا تو میں خود کر لوں گا۔ تم بس یہ کرنا کہ کل دوپہر کے بعد گھر میں رہنا اور جب وہ لوگ آئیں تو پردہ وغیرہ کرا لینا۔ ویسے بھی کل اتوار ہے۔ تم نے کام شام پر تو جانا نہیں ہوگا۔"

"جیسے آپ کی مرضی جی۔" رؤف نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں ذرا دوسروں کو بھی اطلاع دے دوں۔" ملک صاحب نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

رؤف کا گھرانہ اسی بلڈنگ میں 1948ء سے رہ رہا تھا۔ شروع میں والد صاحب نے یہاں دوسری منزل پر تین کمرے کا گھر کرائے پر لیا تھا۔ بعد میں وہ تو بڑے بھائی کے ساتھ ایک دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے لیکن رؤف اپنے بچوں کے ساتھ یہیں پر رہا۔ یہ اچھرہ کی اندرونی آبادی تھی اور یہاں اس طرح کے پرانے مکانات کافی تعداد میں تھے۔

اگلے روز مہمانوں کی آمد گیارہ بجے کے قریب ہوگئی۔ یہ لوگ ایک اسٹیشن ویگن پر سوار ہو کر آئے تھے۔ ان کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ تھانیدار سمیت چار پولیس اہلکار بھی ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ ایک جیپ میں چند فوجی بھی تھے۔ مہمان عمارت کے اندر آ گئے۔ یہ سب کے سب سکھ تھے۔ شکلوں اور کپڑوں سے خوش حال ہی دکھائی دیتے تھے۔ بلڈنگ کے مکینوں نے ان کا استقبال خوش دلی سے کیا۔ ملک اللہ بخش بھی بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ یہ سردیوں کے آغاز کے دن تھے۔ اللہ بخش نے مٹھائی سے مہمانوں کی تواضع کی۔ ساتھ میں اچھی سی چائے بھی تھی۔ مہمان مختلف گھروں میں داخل ہو گئے اور اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے لگے۔ وہ 1947ء میں یہاں سے گئے تھے اور اب قریباً سترہ سال بعد واپس آئے تھے۔ یہ 1964ء کا سال تھا اور نومبر کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔

مہمانوں کے درمیان کچھ کھسر پھسر بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ فوجی اور پولیس اہلکار بھی آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ مہمانوں میں سے دو افراد رؤف کے گھر میں بھی گھوم پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مختلف چیزوں کو چھو رہا تھا۔ انہیں محبت سے ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رؤف کا ہمسایہ "تنویر گھڑی ساز" رؤف کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "یہ لوگ صرف سیر کے لیے نہیں آئے۔ ان کا کچھ اور مطلب بھی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" رؤف نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"یہ لوگ یہاں سے اپنی کچھ چیزیں بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ تھانیدار نے ملک صاحب سے کہا ہے کہ یہ اگر یہاں سے کچھ لے جانا چاہیں تو انہیں لے جانے دیا جائے۔ اعتراض نہ کیا جائے۔"

رؤف کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ "لیکن یہ کیا لے جائیں گے۔ دروازے اور کھڑکیاں تو اتار کر لے جا نہیں سکتے۔ نہ ہی اینٹیں اکھاڑ کر لے جائیں گے۔"

"مجھے کچھ اور چکر لگ رہا ہے۔" تنویر نے آنکھیں گھما کر مدھم لہجے میں کہا۔

"کیسا چکر؟"

"میرا خیال ہے کہ یہاں ان کی کچھ قیمتی چیزیں ہیں۔ شاید کوئی مال شال چھپایا ہوا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا یار۔ جب پاکستان بنا اس وقت ان سارے علاقوں میں حالات بڑے خراب ہو گئے تھے۔ ہر کسی کو اپنے جان مال کی فکر پڑ گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اپنا قیمتی سامان اپنے گھروں کے اندر ہی خاص طریقوں سے چھپا لیا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں بینکوں وغیرہ کا رواج کہاں تھا۔ زیادہ لوگ اپنی قیمتی چیزیں گھروں کے اندر ہی سنبھالتے تھے۔ بڑے بڑے طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔"

''تو کیا یہ لوگ اب ہمارے گھروں میں کھدائی
دائی کریں گے؟''

''اللہ جانے کیا کریں گے۔ یہ سارے ایک ہی
رادری کے لوگ ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں کپڑے
ی دکانیں کرتے تھے۔ کافی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ پتا نہیں
ب ان لوگوں نے کیا چھپایا ہے اور کہاں کہاں چھپایا ہے۔''

اسی دوران میں ایک تنومند سردار صاحب ساتھ والے
گھر سے برآمد ہوئے۔ بسنتی رنگ کی پگڑی کے نیچے ان کا
چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں کسی دروازے کے
دو بڑے بڑے آہنی ہینڈل تھے۔ وہ یہ ہینڈل ایک مقامی
مستری کی مدد سے اکھاڑ کر لائے تھے۔ ان ہینڈلوں کا وزن
کسی طور بھی آدھ سیر سے کم نہیں تھا۔ ان پر سیاہ رنگ کے
روغن کی موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد رؤف اور تنویر
پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ یہ ہینڈل سونے کے ہیں۔

تنویر نے کانپتی آواز میں سرگوشی کی۔ ''یار! اس طرح
کے ہینڈل تو دو تین اور گھروں میں بھی لگے ہوئے ہیں۔
کرمو کے گھر پچھلے اسٹور میں جو لکڑی کا موٹا دروازہ
ہے اس میں بھی یہ ہینڈل ہیں اور ماسٹر نذیر کے گھر
سیڑھیوں کے نیچے جو کمرا ہے......''

ابھی تنویر کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ کرمو کے گھر سے
بھی ایک سردار اور سردارنی مطمئن چہروں کے ساتھ برآمد
ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ویسے ہی سیاہ ہینڈلوں کے دو
جوڑے تھے۔ سردار صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا پیچ کش
بھی تھا۔ غالباً یہ ہینڈلز انہوں نے خود ہی اتار لیے تھے۔

اسی دوران میں نچلی منزل سے بھی اکھاڑنے اور
توڑنے کی مختلف آوازیں آنے لگیں۔ رؤف کے عین نیچے
والے گھر میں شاید کسی دیوار کی اینٹیں بھی علیحدہ کی جا رہی
تھیں۔ تین چار مقامی مستری پولیس والوں کے ساتھ تھے اور
وہ اس اکھاڑ پچھاڑ میں مہمانوں کی مدد کر رہے تھے......

''دیکھیں، اب ہمارے گھروں سے کیا نکلتا ہے؟''
رؤف نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میرے خیال میں تمہارے گھر میں تو ایسے ہینڈل
نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے گھر میں ہیں۔ شاید وہاں کچھ اور
چیزیں ہوں گی۔'' تنویر نے کہا۔

دو سردار صاحب ایک پولیس اہلکار کے ساتھ مسکراتے
ہوئے تنویر کے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ تنویر بولا۔ ''اچھا،
میں چلتا ہوں۔ تم بھی ذرا دھیان رکھو۔'' اس کے ساتھ ہی
تنویر تیز قدموں سے اپنے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ساری بلڈنگ کی عورتوں کو ملک صاحب نے اوپر ماسٹر نذیر کے گھر میں ہی جمع کر دیا تھا۔ گھروں میں اب مرد یا چھوٹے بچے ہی تھے۔ وہ حیرت اور قدرے تجسس سے مہمانوں کی ان کارروائیوں کو دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے بچے مہمانوں سے معصومانہ انداز میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

رؤف کے گھر میں جو دو افراد داخل ہوئے تھے، ان میں سے ایک تو سب سے اوپر والی چھت پر چلا گیا تھا اور طائرانہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ دوسرا جو اونچی ناک اور لمبے قد والا درمیانی عمر کا سکھ تھا، ابھی تک گھر میں گھوم رہا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''عبدالرؤف جی۔''

''میرا نام کرشن سنگھ ہے۔ یہاں پٹیالہ کلاتھ ہاؤس کے نام سے ہماری دکان ہوا کرتی تھی، باپو جی کو بہت لوگ جانتے تھے یہاں۔ اس علاقے میں سب سے پہلی موٹر سائیکل شاید ہم نے ہی خریدی تھی۔ واہگرو کا بڑا اکرم رہا ہے ہم پر۔''

''آج کل آپ کہاں ہوتے ہو؟'' رؤف نے پوچھا۔

''جالندھر میں۔ وہاں بھی کپڑے کا کام ہی کر رہے ہیں۔ جالندھر تو پچھلے سترہ اٹھارہ سالوں میں بہت بدل گیا ہے۔ مگر یہاں لگتا ہے کہ کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا چھوڑ کر گئے تھے۔'' کرشن سنگھ نے گھر کے در و دیوار پر ایک نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

رؤف کو ایسا لگا جیسے یہ شخص گھر کی خستہ حالی کا مذاق اڑا رہا ہے۔ یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔ کچھ دیر تک وہ رؤف سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے کچھ پرانے جاننے والوں کے نام بتائے۔ ان میں سے کچھ کے نام تو رؤف نے پہلی بار سنے تھے۔ ایک ہیڈ ماسٹر رضا صاحب کے بیٹے شکیل کو رؤف جانتا تھا، وہ آج کل قطر میں تھا۔ ایک دوسرا لڑکا سلیم کراچی میں گارمنٹس کا کام کرتا تھا۔

رؤف سے باتیں کرتے ہوئے بھی کرشن کی نظریں بار بار اندرونی کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جہاں ایک دیوار پر رؤف اور اس کے گھر والوں کے میلے کچیلے کپڑے کھونٹیوں پر لٹکے تھے۔

شام پانچ بجے تک انڈیا سے آنے والے مہمان اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے بلڈنگ کے مختلف گھروں سے تقریباً بیس ہینڈلز اتارے تھے۔ یہ وزنی ہینڈل ایک ہی ساخت اور وزن کے تھے۔ یہ تقریباً ساڑھے چار، پانچ سیر سونا تھا اور صرف یہ ہینڈلز ہی نہیں تھے۔ کچھ اور سونا بھی مختلف چیزوں کی شکل میں ڈھلوا کر محفوظ کیا گیا تھا۔ ایک گھر سے دیوار میں چنی ہوئی ایک چھوٹی سی سیف کا دروازہ اتروایا گیا تھا۔ یہ قریباً ایک مربع فٹ کا دروازہ خالص سونے کا تھا۔ اسی طرح بالائی منزل کی ایک چوبی چھت سے پنکھا لٹکانے والا کنڈا اتارا گیا تھا۔ کنڈے کے ساتھ چوتھائی انچ موٹی دھاتی پتری بھی تھی۔ یہ کنڈا اور پتری ملا کر قریباً ڈیڑھ سیر وزن بنتا تھا، یہ دونوں چیزیں بھی سونے کی تھیں۔ رؤف کے گھر سے کرشن سنگھ نے کپڑے لٹکانے والی پانچ عدد کھونٹیاں اتروائی تھیں۔ یہ کھونٹیاں لکڑی کی ایک چار انچ چوڑی پٹی پر لگی ہوئی تھیں۔ ان پر موٹا روغن تھا اور ان کا وزن بھی پون سیر سے کم نہیں تھا۔ اسی طرح ایک بوڑھے سردار اور اس کی بیوی نے ایک گھر میں، نانک چندی اینٹوں کی ایک اندرونی دیوار اکھڑوا کر اس میں سے چاندی کے کچھ زیورات اور سونے کے سکے نکلوائے تھے۔

شام کی چائے پی کر اور سب کا شکریہ ادا کر کے وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بچوں کو انہوں نے چھوٹے موٹے تحائف بھی دیے۔ وقتِ رخصت اونچی ناک والے کرشن نے رؤف کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بھئی۔ ویسے ابھی ہم تمہارے شہر لاہور میں ہی ہیں۔ پانچ چھ دن یہاں کی سیر کریں گے۔ ہم اسٹیشن کے پاس ہوٹل گلزار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ من چاہے تو آ جانا۔ دس نمبر کمرا ہے میرا۔''

''اچھا جی۔'' رؤف نے مختصر ترین جواب دیا۔ ویسے ہوٹل گلزار کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔

رات کو رؤف اپنے بستر پر دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی نگاہ بار بار دیوار کے اس نشان کی طرف جاتی تھی جہاں سے کھونٹیوں والی پٹی اتاری گئی تھی۔ اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا جیسے اس سے دھوکا کیا گیا ہے۔ اسے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ بلکہ بلڈنگ کے سارے مکینوں کو بے وقوف بنایا گیا ہے۔ یہ بس اس کی سوچ تھی۔

''کیا بات ہے؟ سو کیوں نہیں رہے؟'' فاخرہ نے اس کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

رؤف نے ایک لمبی آہ بھری۔ ''کچھ نہیں۔ سوچ رہا ہوں ہم سولہ سال یہ کھونٹیاں استعمال کرتے رہے اور ہمیں کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کیسے کیسے مشکل دور ہم پر آئے ہیں، اگر

نہیں پتا ہوتا کہ ہمارے گھر میں یہ پون سیر سونا پڑا ہوا ہے تو تھی مصیبتوں سے بچ جاتے۔ اللہ بخشے امی کا علاج ہو جاتا۔ چھوٹا آصف موٹر مکینک بننے کے بجائے پڑھ... جاتا اور پتا نہیں کیا کچھ ہو جاتا۔"

"پر جو چیز ہماری قسمت میں نہیں تھی، وہ ہمیں کیسے مل سکتی تھی۔ اب ان باتوں کو سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" فاخرہ نے کہا۔

"اوپر والا بھی پتا نہیں کیوں، بھرے ہوئے گھروں کو ہی بھرتا ہے۔ اب یہ جو سردار صاحب تشریف لائے تھے، یہ سب کے سب جالندھر کے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اپنی ہوشیاریوں سے انہوں نے خوب مال بنایا ہوا ہے۔ اب یہ چیزیں ان کو نہ بھی ملتیں تو ان کو کوئی خاص فرق نہیں پڑنے والا تھا۔"

"بھئی فرق پڑتا یا نہ پڑتا۔ وہ ان چیزوں کے مالک تھے۔ ہم نہ لینے والوں میں نہ دینے والوں میں۔ اگر کوئی پریشانی ہو سکتی ہے تو ہمارے مالک مکان کو ہو سکتی ہے۔ جب اس کو نہیں تو پھر ہم کیوں اپنا خون جلائیں۔" فاخرہ نے کہا۔

"لیکن سوچو کہ یہ سونا سولہ سترہ سال ہمارے پاس رہا ہے۔ ہم اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتے تھے۔ ہم بے خبر رہے۔ اور آج وہ لوگ ٹہلتے ہوئے آئے۔ ہم سب کو ایک طرف کھڑا کیا۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے سب کچھ سمیٹ کر لے گئے۔ لالچی کہیں کے۔" رؤف کے آخری الفاظ میں بے حد تلخی تھی۔

"نہیں رؤف! آپ سب کو تو ایسا نہیں کہہ سکتے نا..... ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ واقعی یہاں کی سیر کے لیے بھی آئے ہوں۔ اپنی پرانی جگہیں دیکھنا چاہتے ہوں۔ بندے کو اپنی مٹی کی تھوڑی بہت کشش تو ہوتی ہی ہے نا..... لوگ اپنے پرانے گھروں کو دیکھنے آتے ہی رہتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ نہیں گئے تھے ہیڈ سلیمانکی، اپنے دادا جی کے پرانے کوارٹر دیکھنے کے لیے۔"

"نہیں۔ وہ دیکھنا اور ہوتا ہے۔ یہ لوگ تو اپنا "مطلب" ساتھ لے کر آئے ہوئے تھے۔"

"پر تم سب کو تو ایسا نہیں کہہ سکتے ہو نا.... ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جو بس دروازوں اور دیواروں پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے ہوں گے۔ ان کی محبت ان کی میٹھی میٹھی یادیں ان کو یہاں لائی ہوں گی۔"

"نہیں، کوئی نہیں تھا ایسا۔ تم خوامخواہ ان کی وکیل نہ بنو۔ سب لالچی تھے۔ آنکھوں میں حرص چمکارے مار رہی تھی۔ اب دنیا میں صرف طمع لالچ ہی رہ گیا ہے۔ محبتیں، میٹھی میٹھی یادیں سب بے کار کی باتیں ہیں۔ اب ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اب بس سونے چاندی کو پوچھا جاتا ہے۔" رؤف نے جل کر کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

اس کی نگاہ بار بار دیوار کے نشان کی طرف اٹھ جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہی اونچی ناک اور تیز بادامی آنکھوں والا کرشن سنگھ اس کی نگاہوں میں آ جاتا تھا۔ کتنا گھرا پن تھا اس کے دیدوں میں۔ کیسی تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ وہ دیر تک اپنے گھر کی پانچ کھونٹیوں کے بارے میں اور کرشن سنگھ کے بارے میں سوچتا رہا پھر سو گیا۔

صبح بھی اس کا دل کام پر جانے کو نہیں چاہا۔ ویسے بھی دیہاڑی لگنے کی امید کم ہی تھی۔ وہ عجیب افسردہ سی کیفیت میں کمرے میں پڑا رہا اور سوچتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔

کل جب کرشن سنگھ نے اسٹیشن کے گلزار ہوٹل کا ذکر کیا تھا تو وہ تھوڑا سا چونکا تھا۔ اس کے چونکنے کی وجہ تھی۔ گلزار ہوٹل کے ساتھ ہی ذیشان ہوٹل کی بلڈنگ تھی اور اس ہوٹل میں لکڑی کا قریباً ایک تہائی کام رؤف نے کیا تھا۔ اس کام کے دوران میں ہوٹل کے چھوٹے منیجر فاروق بٹ صاحب سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی کبھی کبھی ان کے پاس جا بیٹھتا تھا اور چائے پینے کے علاوہ گپ شپ بھی کر لیتا تھا۔

پتا نہیں کیوں سارا دن رؤف کا دماغ ہانڈی کی طرح ابلتا رہا اور وہ کرشن سنگھ کے بارے میں سوچتا رہا۔ بلڈنگ میں رہنے والے باقی پڑوسیوں کے تاثرات ملے جلے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ٹھیک ہے جن کی چیزیں تھیں وہ لے گئے۔ کچھ خود کو شرمندہ سا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ وہ بے وقوف بنے ہیں۔ ان میں ماسٹر نذیر بھی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سن 47ء میں مسلمان بھی اپنی بے شمار جائداد اور قیمتی سامان ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ جس کا جہاں "جو" رہ گیا وہ رہ گیا۔ اب اس طرح آنا اور بستے گھروں میں آ کر توڑ پھوڑ کرنا کہاں کا بھائی چارہ ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ ماسٹر نذیر نے وہ چھوٹے موٹے تحفے بھی پھینک دیے تھے جو مہمان ان کے تین بچوں کو دے گئے تھے۔

☆☆☆

یہ چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے۔ رؤف، ہوٹل ذیشان میں اسسٹنٹ منیجر فاروق بٹ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آج سردی غیر متوقع طور پر زیادہ تھی۔ شام کے فوراً بعد سے ہلکی دھند بھی پھیل گئی تھی۔ ریکارڈ پلیئر پر گانے بج رہے تھے۔ فاروق بٹ نے اسے اچھی نسل کے دو چار سگریٹ بھی پلائے۔ بارہ بجے کے قریب وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا

ہوا۔ دیکھنے والوں کو بظاہر یہی لگا ہوگا کہ وہ بیرونی دروازے سے نکل گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ وہ لان میں پہنچ کر بائیں طرف مڑ گیا اور ایک اسٹور میں موجود تنگ زینوں سے ہو کر بالائی منزل پر آ گیا۔ اس نے یہاں قریباً چھ ماہ تک کام کیا تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔

ایک نیم تاریک کوریڈور سے ہو کر وہ اس چھوٹے سے ٹیرس میں آ گیا جہاں ہوٹل کے کمروں کی عقبی کھڑکیاں کھلتی تھیں...... اس ٹیرس میں چھوٹی موٹی بے کار اشیا پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ہوٹل کے عملے کا کوئی فرد ان اشیا کو پھلانگ کر گزرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ رؤف اس بالکونی نما ٹیرس سے گزرتا ہوا آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں دوسرے ہوٹل گلزار کا ٹیرس ذیشان ہوٹل کے ٹیرس سے ملتا تھا، درمیان میں بمشکل سے تین فٹ کا فاصلہ ہوگا۔

رؤف کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دس نمبر کمرا ٹیرس میں تین کمرے چھوڑ کر آئے گا۔ گہری تاریکی اور ہلکی دھند رؤف کی معاون تھی۔ وہ گلزار ہوٹل کے ٹیرس پر اترا۔ اس نے دس نمبر کمرے کی کھڑکی کے پٹ کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ ایک گہری مایوسی اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ غالباً سردی کی وجہ سے زیادہ تر کھڑکیاں بند کر لی گئی تھیں۔ اب رؤف کے پاس دوسرا "چانس" دروازے کا تھا۔ عقبی کھڑکی کی طرح یہ عقبی دروازہ بھی اس بالکونی نما ٹیرس میں کھلتا تھا۔ ایک کارپینٹر کی حیثیت سے رؤف کو پتا تھا کہ اکثر لوگ آہنی تالوں کو بند کرنے کے بعد ان کی چابیاں تالوں کے اندر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال، اندر گھسنے والوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

رؤف نے چابی کے سوراخ میں ماچس کی تیلی گھسا کر دیکھی اور اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ تالے کی چابی تالے میں ہی تھی۔ رؤف نے ایک آزمایا ہوا کارگر طریقہ استعمال کیا۔ اس نے قمیص کی جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا۔ اسے سیدھا کیا اور پھیلا کر دروازے کی نچلی درز سے کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ پھر اس نے ماچس کی تیلی سے چابی کو چھیڑا، وہ کمرے کے اندر پھیلے ہوئے اخبار پر جا گری۔ کمرے میں قالین موجود تھا اس لیے چابی گرنے کی زیادہ آواز بھی نہیں آئی۔ رؤف نے احتیاط سے اخبار باہر ٹیرس میں کھینچ لیا۔ چابی اس پر موجود تھی۔

اگلے دو منٹ کے اندر رؤف دروازہ کھول کر تاریک کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ کرشن سنگھ کے مدھم خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ رؤف نے چھوٹی ٹارچ کی مدد سے کمرے کا جائزہ لیا۔ جلد ہی اسے ایک چھوٹا سفری بیگ نظر آ گیا۔ اس نے بیگ کو ٹٹولا۔ خوشی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے اتنی جلدی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اسے بیگ کے اندر کھونٹیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کھونٹیوں کو لکڑی کی چوکی سے علیحدہ کیا جا چکا تھا۔ بیگ کی زپ کھول کر اس نے کھونٹیوں کی موجودگی کا یقین کیا۔ اس کے بعد اس نے ٹارچ بجھا دی اور دھیمے قدموں سے بیگ سمیت دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اس کا پاؤں قالین پر پڑے شیشے کے جگ سے ٹکرایا۔ آواز پیدا ہوئی۔ کرشن سنگھ کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔

''کون......؟ کون ہے اوئے؟'' اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

رؤف سمجھ گیا کہ اس نے ذرا سی تاخیر کی تو کرشن سنگھ شور مچا دے گا۔ اس نے بے حد پھرتی سے قریب پڑی ایک آہنی کرسی اٹھائی اور طاقت سے کرشن سنگھ کے سر پر دے ماری۔

''اوئے میں مر گیا'' کرشن ڈکرایا...اور بیڈ سے نیچے گر گیا۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رؤف نے اس کے سر پر کرسی کا دوسرا وار کیا۔ اس شدید وار سے وہ بے سدھ ہو گیا۔ چند لمحے تک اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد رؤف نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا اور باہر ٹیرس میں آ گیا۔ ٹیرس جو تاریکی اور دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

تین چار دن تک رؤف خاموشی سے اپنے گھر میں موجود رہا۔ اس نے کرشن سنگھ کا سفری بیگ گھر کے ایک غسل خانے میں فلش کی خالی ٹنکی کے اندر چھپا دیا تھا۔ بیگ میں پانچ کھونٹیوں کے علاوہ کچھ پاکستانی کرنسی بھی تھی۔ اس کے علاوہ ٹوتھ پیسٹ، برش، ماؤتھ واش اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی تھیں۔ تین چار دن رؤف کافی ڈرا رہا۔ یہ تو اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کرشن سنگھ بچ گیا ہے۔ پھر بھی یہ ایک سنگین واردات تھی۔ اگر کرشن نے باقاعدہ رپورٹ وغیرہ درج کرائی تھی تو تفتیش کا دائرہ یہاں اچھرے تک اور اس بلڈنگ تک بھی پھیل سکتا تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کرشن کے حوالے سے رؤف کے سارے اندیشے بس اندیشے ہی رہے۔ چوتھے پانچویں دن رؤف منی بس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچا اور اس نے تصدیق کی کہ کرشن سنگھ اپنے باقی ساتھیوں سمیت انڈیا واپس جا چکا ہے۔

ٹوہ لینے کی غرض سے رؤف نے فاروق بٹ سے پوچھا۔ ''فاروق صاحب! سنا ہے ساتھ والے ہوٹل میں جو سکھ

مہمان آئے ہوئے تھے ان میں سے ایک زخمی شخص ہو گیا تھا؟"
"ہاں، میں نے بھی سنا ہی ہے۔ شاید سیڑھیوں سے
گر کر سر پھٹ گیا تھا سردار جی کا۔ کافی چوٹیں آئی تھیں۔ نشے
میں تو ویسے بھی ہمارے سرداروں کو دس سیڑھیوں کی ایک
سیڑھی نظر آتی ہے۔" فاروق بٹ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
رؤف مطمئن ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی
تھی کہ اس واقعے کی سرے سے کوئی رپورٹ ہی درج
نہیں ہوئی ہے۔ کیوں نہیں ہوئی؟ اس کا جواب کرشن
سنگھ ہی دے سکتا تھا۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ جو ہونا تھا
وہ تو ہو گیا۔ اب قانونی چکروں میں پڑ کر کہیں اس کی
واپسی ہی ڈانواں ڈول نہ ہو جائے۔
کرشن سنگھ اور اس کی واپسی سے پوری طرح مطمئن
ہونے کے بعد رؤف گھر پہنچا۔ بیوی کو جھڑک کر اور تھوڑا
سا غصہ دکھا کر اس نے ایک دن کے لیے اسے بچوں سمیت
میکے بھیج دیا۔ فلش کی ٹنکی کے اندر سے اس نے سفری بیگ نکالا
اور بیگ میں سے پانچ عدد کھونٹیاں...... وہی کھونٹیاں جو سترہ
سال تک اس کی دسترس میں رہی تھیں اور وہ ان کی حقیقت
سے بے خبر رہا تھا...... اس نے آری تیز کرنے والا ٹکورا نکالا
اور اس کے ساتھ ایک کھونٹی کو رگڑنا شروع کیا۔ کھونٹی کا بالائی
رنگ اتر گیا اور پھر دھات کٹنا شروع ہوئی...... لیکن دھات کا
رنگ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ سنہری چمک نظر نہیں آ رہی تھی جو آنی
چاہیے تھی...... اور پھر ایک دم رؤف کو اندازہ ہوا کہ یہ کھونٹی
سونے کی نہیں لوہے کی ہے۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔
...... اگلے پانچ منٹ میں رؤف نے پانچوں کی پانچوں
کھونٹیاں رگڑ کر دیکھ لیں...... پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ان میں
سے ایک بھی سونے کی نہیں تھی۔ سب لوہا تھا۔
اس کے علاوہ رؤف نے ایک اور چیز نوٹ کی۔
ان کھونٹیوں پر اندر کی طرف باریک مارکر سے نمبر بھی
لکھے گئے تھے۔ ایک دو تین...... چار پانچ۔ یہ نمبر پچھلے
چند روز میں ہی لکھے گئے تھے۔
کئی گھنٹے تک رؤف کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا
ہے۔ اگر یہ کھونٹیاں لوہے کی تھیں تو پھر انہیں اکھاڑ کر لے
جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ نمبر؟
کرشن سنگھ کے بیگ میں سے جو مختلف اشیا ملی تھیں ان
میں ایک ڈائری بھی تھی۔ ڈائری کے بیس پچیس صفحات پر
ہاتھ سے لکھا گیا تھا اور ان پر تاریخیں وغیرہ بھی پڑی ہوئی
تھیں۔ آخری تاریخ اس واقعے سے پانچ دن پہلے کی تھی جب
رؤف، کرشن سنگھ سے بیگ چھین کر لایا تھا۔ اس تاریخ کے
نیچے کرشن نے تین چار صفحے لکھے تھے۔
رؤف زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اخبار تو پڑھ ہی سکتا
تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اس آخری تاریخ کی تحریر کو پڑھنا
شروع کیا۔ جو کچھ رؤف کے علم میں آیا وہ اس کے اندازوں
سے بالکل مختلف تھا۔ کرشن کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔
"آج میں خوش ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ نراش
بھی۔ آج میں نے سترہ سال بعد وہ گھر دیکھا ہے، جہاں میں
نے آنکھ کھولی۔ ماں کی لوریاں سنیں، باپو کے کندھوں پر
سواری کی۔ جہاں ہم دونوں بھائیوں نے اپنے ماتا پتا کے
ساتھ جیون کے بہترین دن گزارے۔ آج مجھے اس گھر کی
ایک ایک اینٹ سے اپنے گمشدہ جیون کی آوازیں سنائی دی
ہیں۔ وہ سارے قہقہے، سارے آنسو، ساری شرارتیں،
سارے موسم اور تہوار اس گھر کی دیواروں میں بند ہیں،
جنہیں میں مر کر بھی نہیں بھول سکتا۔
"من تو یہ چاہتا تھا کہ میں اس سارے کے سارے گھر
کو اٹھا کر اپنے ساتھ جالندھر لے جاؤں لیکن ایسا ہو نہیں
سکتا۔ پھر بھی ایک نہایت قیمتی شے وہاں سے اپنے ساتھ لے
آیا ہوں۔ یہ برآمدے کے ساتھ والے بڑے کمرے میں
کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں ہیں۔ میری یادوں میں یہ
کھونٹیاں ہمیشہ چمکتی رہی ہیں۔ گئے موسموں میں میں نے
انہیں بہت دفعہ یاد کیا ہے۔ ان کھونٹیوں کے ساتھ میرے
بائیس برسوں کی بڑی سندر سندر یادیں لگی ہوئی ہیں۔ اپنی
لکھی ہوئی ایک پرانی کویتا میں، میں نے ان یادوں کی
جھلک دکھائی ہے۔ اب بھی میری شاعری میں کہیں کہیں اس
کمرے اور ان کھونٹیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔"
اس سے نیچے ہندی اور پنجابی کے تین چار خوبصورت شعر
لکھے گئے تھے۔ ان شعروں کے بعد تحریر پھر شروع ہو جاتی تھی۔
"ان کھونٹیوں میں سے ایک نمبر کھونٹی باپو کی ہے۔ یہ
سب سے دائیں طرف لگی ہوئی تھی۔
"باپو کی پگڑی اور کپڑے وغیرہ ہمیشہ اسی کھونٹی پر
ہوتے تھے۔ میں آج بھی تصور کی نظر سے ان کپڑوں کو
دیکھ سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر کی کھونٹی ماں کی تھی۔ کھونٹی پر
لٹکی ہوئی ماں کی چادر ہمیشہ ہی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔
جب کبھی ماں گھر میں نہیں ہوتی تھی تو میں اس کھونٹی کے
نیچے کھڑا ہو کر اور ماں کے کپڑوں کو سونگھ کر ماں کی کمی
پوری کر لیا کرتا تھا۔ بچپنے میں ماں کے کپڑوں کا لمس بھی
ماں ہی کی طرح پیارا اور مہربان لگتا تھا۔ تیسری کھونٹی
میری اور چوتھی میرے چھوٹے بھائی اجیت کی تھی۔

''باپو جی اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ ہم سب صرف اپنی اپنی کھونٹی ہی استعمال کرتے تھے۔ بعد میں، میں نے ہر کھونٹی کے نیچے دیوار پر کھونٹی والے کا نام لکھ دیا تھا۔ باپو جی، ماتا جی، کرشن، اجیت۔

''ہاں تین نمبر کھونٹی میری تھی۔ مجھے اپنا پہلا جنم دن تو یاد نہیں لیکن تیسرا دھندلا دھندلا سا یاد ہے۔ میرا وہ چمکیلا جوڑا اس کھونٹی پر لٹک رہا تھا جو میں نے شام کو پہنا تھا...... اسی کھونٹی پر میں نے خوشیوں بھری بیساکھی اور دیوالی کے جوڑے لٹکے دیکھے تھے اور پھر میرے اسکول کا وہ پہلا دن جب میں روتا ہوا غسل خانے سے نکلا تھا۔ ماں نے اسی کھونٹی سے میری نئی نکور یونیفارم اتار کر مجھے پہنائی تھی۔ ان دنوں، اسی کھونٹی کے نچلے سرے پر میرا اسکول بیگ بھی لٹکا رہتا تھا۔ اجیت، ان دنوں ابھی بہت چھوٹا تھا اور اس کی کھونٹی سے اس کی چھوٹی چھوٹی چڈیاں اور کھلونے وغیرہ لٹکے ہوتے تھے۔

''...... ہاں تین نمبر کھونٹی میری تھی۔ مجھے یاد ہے جب اسکول سے امتحان کی ڈیٹ شیٹ ملتی تھی تو میں ڈیٹ شیٹ کا کاغذ کھونٹی کے نچلے سرے میں پرو دیا کرتا تھا۔ آتے جاتے ڈیٹ شیٹ پر نظر پڑتی رہتی تھی اور جب امتحان ختم ہوتے تھے تو اس ڈیٹ شیٹ پر جھپٹنے اور اسے پرزے پرزے کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا تھا اور پھر وہ وقت آیا تھا جب چار نمبر کھونٹی پر بھی اسکول بیگ لٹکنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اور اجیت بڑے ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری مصروفیات بھی بدل رہی تھیں۔ اب ہم اپنی چیزیں الماریوں میں بھی رکھتے تھے مگر کھونٹیاں استعمال کرنے کا اپنا ہی سواد تھا۔

''ہمارے بیڈمنٹن کے ریکٹس ہماوے ٹرانزسٹر ریڈیو، کوڈک کا چوکور کیمرا، فوراسٹار کی دوربین سب کچھ ان کھونٹیوں پر ہی جھولتا رہتا تھا۔ پانچ نمبر والی کھونٹی مشترکہ تھی۔ اجیت اس کو ''کامن ہینگر'' کہا کرتا تھا۔ اس کو بوقتِ ضرورت ہر کوئی استعمال کر لیتا تھا۔

''سمے گزرتا رہا۔ دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے اور پھر یوں ہوا کہ پانچ نمبر والی مشترکہ کھونٹی بھی مشترکہ نہ رہی۔ ایک دن اجیت نے مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پانچ نمبر پر لٹکی ہوئی ساری چیزیں اتار کر ایک طرف رکھ دیں اور کہا تھا۔ ''خبردار اب اس ہینگر کو کوئی استعمال نہیں کرے گا۔ یہ ہماری ہونے والی بھابی جی کا ہینگر ہے۔''

میں نے کہا تھا۔ ''اوئے لڈ مینگ! ابھی وہ آئی کہاں ہے۔''

''نہیں آئی تو آ جائے گی ایک دو مہینے میں۔ تیاریاں تو شروع ہو ہی چکی ہیں۔'' اجیت نے ترنت جواب دیا تھا اور پھر پانچ نمبر کھونٹی کے نیچے دیوار پر باریک مارکر سے ''دیدی امریتا'' لکھ دیا تھا۔

''یہ امریتا ہی تھی جس کو دیکھ کر میں نے پہلے پہل شاعری شروع کی تھی۔ امریتا جیسی لڑکی کو دیکھ کر کوئی شاعری کیے بنا کیسے رہ سکتا ہے؟ وہ ہمارے دور کے رشتے دار تھے اور لاہور ہی میں رہتے تھے۔ ان کا گھر شاہ عالمی میں تھا۔ لمبے، پنڈلیوں تک جاتے ہوئے بال، ہلکی بادامی آنکھیں، بوٹا سا قد، ہنستے ہوئے بائیں گال میں چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا۔ سگائی کے بعد کبھی کبھی میری اور اس کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ ہر ملاقات'' میرے قلم سے ایک نئی کویتا کو جنم دیتی تھی۔ جن دنوں میرے ویاہ کی تیاری ہو رہی تھی، انہی دنوں علاقے کے حالات بھی خراب ہونا شروع ہو گئے۔ مختلف جگہوں سے گڑبڑ کی خبریں آ رہی تھیں۔ بہرحال میرا ویاہ ہو گیا اور امریتا روشنی بن کر ہمارے گھر میں اتر آئی۔ اس کے آنے سے ہمارے گھر کے در و دیوار جگمگا اٹھے تھے۔ اس کی معصوم ہنسی جلترنگ کی طرح ہمارے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اور پازیبوں کی کھن کھن میں دنیا جہاں کی خوشیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈیڑھ دو مہینے میں ہی پریوار کے ہر فرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اس کے ساتھ ہی بڑے کمرے کی پانچ نمبر کھونٹی بھی آباد ہو گئی۔ اس کھونٹی کو ایک بالکل نئی شناخت مل گئی۔ اس کھونٹی پر میں نے امریتا کے گوٹے کناری والے کپڑے لٹکے دیکھے۔ اس کے سرخ اور سنہری پرس، اس کے رنگ برنگے پراندے...... اور بہت کچھ۔ اب یہ صرف اور صرف اس کی کھونٹی تھی اور ہر وقت خوشبوؤں سے مہکی رہتی تھی۔ اسی طرح آٹھ دس ماہ گزر گئے۔

''...... لیکن پھر ایک دن اچانک یہ ساری کھونٹیاں خالی ہو گئیں۔ یہ کھونٹیاں ہی خالی نہیں ہوئیں گھر بھی خالی ہو گیا...... اور گھر ہی کی کیا بات، محلوں کے محلے خالی ہو گئے۔ امریتا ان دنوں اپنے میکے شاہ عالمی گئی ہوئی تھی۔ جاتے وقت میری نم آنکھوں کو تسلی دیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''میرے سوہنے موہنے پتی دیو! اتنے نراش کیوں ہوتے ہو۔ بس تین چار دن میں آ جاؤں گی۔''

''اور اگر تمہارے باپو جی نے تین چار دن میں آنے نہ دیا تو؟''

''تو پھر آپ کی یہ پتنی بغاوت کر دے گی۔ پنجرہ توڑ دے گی اور اڑ کر یہاں پہنچ جائے گی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اس کے گال کا گڑھا جان لیوا حد تک دلکش ہو گیا۔

"تمہیں پتا ہے، ہم سب کے یہ تین چار دن کس طرح گزریں گے؟"

"باقیوں کا تو ٹھیک سے پتا نہیں لیکن آپ کا پتا ہے۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں نا کہ اڑ کر پہنچ جاؤں گی۔"

وہ لپک کر میرے گلے لگی تھی اور پھر میرا گال چوم کر دروازے کی طرف مڑ گئی تھی۔

"وہ تین چار دن کا کہہ کر گئی تھی لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ اسے تین چار جنموں تک بھی واپس نہیں آنا۔

"امریتا کے جانے کے دو دن بعد ہی شاہ عالمی میں خوفناک فساد ہوا۔ وہ آگ بھڑکی جس کا دھواں ابھی تک لوگوں کے دم گھونٹ دیتا ہے۔ امریتا کے باپو، ماتا اور دو چچا اس فساد میں مارے گئے۔ امریتا بچ گئی تھی مگر اسی طرح بچی تھی جس طرح سرحد کے دونوں طرف کی ہزاروں عورتیں "بچی" تھیں۔ وہ زندہ رہی تھیں نہ ماری گئی تھیں۔ ان میں بیشتر کو سکھوں اور مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ڈال لیا تھا۔ کس نے زیادتی کی کس نے نہیں کی، یہ ایک علیحدہ سوال ہے لیکن اس وحشی آگ کی سب سے زیادہ تپش عورتوں کو ہی جھیلنا پڑی۔ ان روتی چلاتی مجبور ہستیوں کو ان کے پریواروں سے کھینچ کر علیحدہ کیا گیا اور ہمیشہ کے لیے نظروں سے دور کر دیا گیا۔ بتانے والوں نے بتایا۔ امریتا بھی اپنے جلتے ہوئے گھر سے نکل کر بھاگی تھی۔ اس کے لمبے بال چنگاریوں والی سرخ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ گلی کی نکڑ پر موجود کچھ لوگوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے اسے پناہ دی تھی، یا پھر امریتا جیسی...... اپنی کسی عزیزہ کی گمشدگی کا انتقام لیا تھا۔

"تین دن بعد سخت مجبوری کی حالت میں ہمیں بھی مشرقی پنجاب کا رخ کرنا پڑا...... باپو جی کی ایک ٹانگ میں تھری ناٹ تھری کی گولی لگی ہوئی تھی۔ ماں پر بار بار بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ شریر اور آتما کو چور چور کر دینے والے دن تھے۔ میں مر کر بھی انہیں بھول نہیں سکتا ہوں۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا ہوں۔

"سن 48ء اور 55ء کے درمیان میں تین بار پاکستان آیا ہوں۔ امریتا کو تلاش کرنے کے لیے ہر طریقہ اپنایا ہر رستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ نہیں ملی۔ اب میں جان گیا ہوں کہ اسے کبھی نہیں ملنا۔ چنگاریاں چھوڑتی ہوئی سرخ ہوا میں...... شاہ عالمی کی ایک گلی میں میری امریتا کو آخری بار دیکھا گیا تھا...... اور وہ واقعی آخری بار تھی۔ ایسی سرخ ہوا میں گلی کی نکڑ پر اوجھل ہو جانے والی معصوم امریتائیں، رسول بیگمیں اور غلام فاطمائیں پھر کبھی نہیں ملتیں اور اگر ملیں بھی تو انہیں پہچانا نہیں جا سکتا۔

"...... اب میں یہ کھونٹیاں لے کر جالندھر واپس جا رہا ہوں۔ باپو اور ماتا جی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ باپو بیساکھی کے سہارے چلتے ہیں۔ اجیت افسر بن گیا ہے اور میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ میں یہ کھونٹیاں گھر کے کامن روم کی دیوار پر لگا دوں گا۔ یہ سب کھونٹیاں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔ لیکن یہ پانچ نمبر کھونٹی؟ اس کا کیا کروں گا۔ اس نے تو اب خالی ہی رہنا ہے۔ یہ میرے اور میرے پریوار کے درد کو بڑھاتی رہے گی۔ کبھی سوچتا ہوں کہ اس کھونٹی کو یہیں رہنے دوں۔ اس کو استعمال کرنے والی امریتا بھی تو شاید یہیں ہے۔ کسی شہر میں، کسی نامعلوم بستی کے کسی نامعلوم گھر میں۔ تو پھر، جب وہ یہیں ہے تو اس کی یہ کھونٹی بھی یہیں رہے۔ اسی دھرتی پر۔ سوچ رہا ہوں، جاتے جاتے اسے کہیں پھینک جاؤں۔ کسی بہتے پانی میں، کسی لہلہاتے کھیت میں، یا پھر کسی انجان گاؤں کی طرف جاتے ہوئے کسی انجان رستے کے کنارے پر اسے رکھ جاؤں۔"

تحریر ختم ہو گئی۔ رؤف نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ وہ دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ اس کا دل درد سے بھر گیا تھا۔ اپنے ہی الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے فاخرہ سے کہا تھا۔ "اب دنیا میں صرف طمع، لالچ ہی رہ گیا ہے۔ وہ محبتیں، الفتیں، وہ میٹھی میٹھی یادیں، سب بے کار کی باتیں ہیں۔ اب ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اب بس سونے چاندی کو پوچھا جاتا ہے۔"

تو کیا اس نے غلط کہا تھا۔

تو کیا فاخرہ ٹھیک کہہ رہی تھی؟

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔

چند دن بعد رؤف کو ایک کام سے کچھ پیسے ملے تو اس نے ایک پارسل بنوایا۔ اس میں کرشن کے بیگ سے نکلنے والی ساری چیزیں تھیں اور پانچوں کھونٹیاں بھی تھیں۔ کرشن کی ڈائری سے ہی اسے کرشن کا جالندھر کا ایڈریس بھی مل گیا تھا۔ یہ پارسل اس نے جالندھر کے ایڈریس پر بھیج دیا۔ ظاہر ہے، وہ اس پارسل پر اپنا درست نام پتا لکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ یہ پارسل بھیجنے کے بعد اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس پارسل میں اس نے ایک خط بھی رکھا تھا۔ یہ بس ایک فقرے کا خط تھا۔ وہ فقرہ تھا۔ "غلطی ہو گئی یار۔ ماف کر دینا۔"